اسلامی ریاست عصر حاضر میں

(۲)

محمود احمد غازی

اسلامی نظام حکومت و سیاست پر اس عمومی گفتگو کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے عملی مسائل کی طرف بھی ضروری اشارے کر دیئے جائیں جو آج کل عموماً موضوع بحث بنتے رہتے ہیں اور عام طور پر ان امور کے بارے میں علمی اور دینی حلقوں میں خاصی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ امور درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسلامی حکومت (امامت) کس طرح قائم ہوتی ہے۔

۲۔ کیا اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ قائم ہو سکتی ہے۔

۳۔ شوریٰ اور قانون سازی کے حدود کار کیا ہیں

۴۔ کیا اسلامی سیاست میں سیاسی پارٹیاں وجود پذیر ہو سکتی ہیں

۵۔ کیا انتخابات میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔

۶۔ کیا اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنے کی اجازت ہے۔

۱۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔

متعلقہ آیات قرآنی اور احادیث کے گہرے مطالعے سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے حکمرانوں کے تقرر کا حق صرف امت مسلمہ کو حاصل ہے۔ امت کے رہنما صرف وہ لوگ ہونے چاہئیں جنہیں

امت کا اعتماد حاصل ہو اور امت ان پر بھروسہ کرتی ہو۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر زیر گفتگو موضوع سے دلچسپی رکھنے والے تمام مسلم فقہاء اور مفکرین نے بحث کی ہے چند متعلقہ احادیث یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ لعن اللّٰہ امام قوم وھم لہ کارھون

اللہ تعالیٰ کسی قوم کے اس رہنما پر لعنت بھیجتا ہے جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں۔

۲۔ خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم ویصلون علیکم وتصلون علیھم وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم۔

تمہارے بہترین رہنما وہ لوگ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور وہ تم پر درود وسلام بھیجیں اور تم ان پر درود وسلام بھیجو اور تمہارے بدترین رہنما وہ لوگ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں (صحیح مسلم بروایت عوف بن مالکؓ) اس باہمی اعتماد محبت اور بھروسے کی اہمیت پر قدیم مسلم مفکرین نے بھی روشنی ڈالی ہے۔

ہم ان میں سے کچھ کے خیالات یہاں پر نقل کرتے ہیں۔ علامہ سعدالدین تفتازانی (متوفی ۷۹۳ھ/ ۱۳۸۹ء) فرماتے ہیں۔

ومن صفاتھم الضروریۃ ان یکونوا بحیث یتبعھم سائر الناس۔

ان (رہنماؤں) کی ضروری صفات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی حیثیت ایسی ہونی چاہیئے کہ تمام لوگ ان کی پیروی کیا کریں۔(۱)

شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) لکھتے ہیں:

الاصل فی الخلافۃ رضا الناس بہ واجتماعھم علیہ وتوقیرھم ایاہ وان یقیم الحدود ویناضل دون الملۃ وینفذ الاحکام

خلافت کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ خلیفہ سے خوش ہوں اس کے گرد جمع ہوں اس کی عزت کریں اور یہ کہ وہ حدود جاری کرے۔ ملت کا دفاع کرے اور احکام نافذ کرے"۔[۲]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس باہمی اعتماد اور بھروسے کا اظہار اور تحقق کیسے ہو۔ خلفائے راشدین کے انتخاب میں مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ ہمارے مؤرخین نے تفصیل سے ان سب واقعات کا ذکر کیا ہے۔ بالخصوص علامہ ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر نے اپنی مایۂ ناز کتاب البدایہ والنہایہ میں بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہاں ان سب تفصیلات کو دہرانے کا تو موقع نہیں لیکن اتنی بات تو واضح ہے (جیسا کہ انتخاب حضرت عثمان کے ضمن میں علامہ ابن کثیر نے تصریح کی ہے) کہ متعلقہ اشخاص کے بارے میں کسی نہ کسی طرح امت کے اعتماد کا تحقق بہر حال ہوا۔

اس اہم مسئلے کے بارے میں قرآن و سنت کی خاموشی اور خلفائے راشدین کے انتخاب میں مختلف طریقے اختیار کئے جانے کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل سے تعلق رکھتا ہے جن کے بارے میں امت کو پورا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ انسانی عقل اور تجربے کی روشنی میں عرف اور مصلحت کے مطابق نیز شریعت کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے جو طریقہ کار مناسب سمجھے اختیار کرلے۔

یہاں یہ امر واضح کردینا ضروری ہے کہ عرف، مصلحت اور لوگوں کا عام پسندیدہ طرز عمل اسلامی قانون کے ایسے ہی صحیح اور جائز ماخذ ہیں جیسے دوسرے ثانوی ماخذ مثلاً قیاس استحسان یا استدلال وغیرہ مسلمان فقہاء نے ان ماخذ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور نص یا اجماع کی عدم موجودگی میں ان کے جواز کو ثابت کیا ہے۔ عرف کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ عادۃ جمہور قوم فی قول او عمل۔ کسی قوم کا عام طرز عمل قول میں یا عمل میں"۔[۳]

مسلم فقہا نے بھی بہت سے قانونی اصولوں کی بنیاد عرف پر رکھی ہے ان میں سے چند اصولوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

الثابت بالعرف کالثابت بالنص

۱۔ "جو چیز عرف سے ثابت ہو وہ ایسی ہی ہے جیسی نص سے ثابت شدہ چیز"

استعمال الناس حجۃ یجب العمل بھا۔

۲۔ "لوگوں کا عام طرز عمل حجت ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے"

التعیین بالعرف کالتعیین بالنص۔

۳۔ "کسی امر کا عرف کی بنیاد پر متعین کیا جانا ایسا ہی ہے جیسے نص کی بنیاد پر متعین کیا جانا۔"(۴) یہی اہمیت مصلحت کی ہے۔ اسے بھی اسلامی قانون کے ثانوی ماخذ میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اس کی تعریف بطریق ذیل کی گئی ہے۔

"اس سے مراد ہر قسم کی بھلائی اور عام بہبود کا عمل ہے۔ جس کے متعلق شریعت میں صراحۃً یا اشارۃً یا دلالۃً کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو۔"

ہر وہ چیز جو شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی کئے بغیر انسانی زندگی کی پانچ بنیادی ضرورتوں کا تحفظ کرے مصلحت ہے۔ وہ پانچ بنیادی ضروریات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مذہب (۲) روح (۳) عقل و ذہن (۴) اولاد (۵) مال و دولت اور جائیداد

شریعت میں اولی الامر کو وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں تاکہ وہ ان پانچ بنیادی ضرورتوں کے تحفظ کے لئے ضروری اقدامات کر سکیں اور مناسب قوانین اور قواعد و ضوابط تیار کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے فیصلوں کی اکثریت اسی طرح معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ قواعد و ضوابط جو ملک کے عمومی نظم و نسق کی بہتری کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ سڑکوں، عمارتوں، بندوں اور پلوں کی تعمیر، ٹریفک کے اصولوں کی تیاری اور اس طرح کی تمام چیزیں مصالح مرسلہ کے دائرے سے تعلق رکھتی ہیں۔

قومی مفاد سے تعلق رکھنے والے معاملات کے بارے میں لوگوں کی عمومی پسند و ناپسند کے اظہار کے لئے کسی قابل

عمل اور مناسب نظام کی نشوونما بھی عرف اور مصلحت ہی کے سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس طرح حکومت وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ معاہدہ کی دیگر تمام اشکال پر عملدرگی سے اور منصفانہ طور پر عمل درآمد کے لئے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے قواعد وضوابط تیار کرے۔ اسی طرح اسے یہ حق بھی حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اس معاہدے کے لئے بھی نقص سے پاک طریقے دریافت کرے۔ تاہم یہ سب کچھ امت کے نمائندوں کے مشورے سے اور اس سلسلے میں شریعت کے جو بنیادی اصول ہیں ان کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیئے[(۵)]

اس امر کے ثابت ہو جانے کے بعد کہ عوام کی پسند اور اعتماد کے تحقق کا مسئلہ خود امت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے جو چاہے طریقہ اپنا لے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے قدیم فقہا اور سیاسی مفکرین کے خیالات و آراء کی روشنی میں اس تعلق کی بھی وضاحت کریں جو اولی الامر اور امت مسلمہ کے درمیان پایا جاتا ہے۔

امت اور امام کے درمیان جو تعلق ہے اس کی نوعیت ایک معاہدے کی ہے -

چھٹی صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہہ ملک العلماء علامہ علاؤالدین ابوبکر کاسانی نے اس کو وکالت (AGENCY) کے معاہدے سے مماثلت دی ہے۔ امت موکل (PRINCIPAL) ہے اور امام وکیل (AGENT) ہے۔ موکل کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے وکالت (ایجنسی) کا معاہدہ منسوخ کر دے۔ اس طرح امت جب چاہے وکالت (ایجنسی) کے معاہدے کو منسوخ اور اولی الامر کو برطرف کر سکتی ہے۔ امام اور حکومت کے دوسرے کارکن صرف اس وقت تک اپنے عہدوں پر برقرار رہیں گے جب تک امت ان سے خوش اور مطمئن رہے۔ اس معاہدے کے قانونی مضمرات اور اس کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے علامہ کاسانی لکھتے ہیں۔

"جو چیز وکیل کو وکالت سے ہٹا دیتی ہے وہی چیز قاضی کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیتی ہے ان

دونوں میں کوئی فرق نہیں سوائے ایک چیز کے اور وہ یہ کہ جب موکل (PRINCIPAL) مرجاتا ہے یا (موکل کی حیثیت سے) برطرف ہوجاتا ہے تو وکیل (AGENT) بھی خود بخود اپنی یہ حیثیت کھو بیٹھتا ہے لیکن خلیفہ کی موت یا اس کے برطرف ہوجانے کی صورت میں جج اور دوسرے سرکاری حکام اپنے عہدوں سے معزول نہیں ہوتے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ وکیل (AGENT) اپنے موکل کے اختیار کے تحت اس کے ذاتی حق کو استعمال کرتے ہوئے کام کرتا ہے اور اس (موکل) کی موت کی برطرفی اس کی قانونی اہلیت کو ختم کردیتی ہے۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر اس کا مقرر کیا ہوا وکیل وکالت کے منصب پر باقی نہیں رہتا لیکن اس کے برعکس قاضی خلیفہ کے اختیار کے تحت اور اس کا ذاتی حق استعمال کرتے ہوئے کام نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کے اختیار کے تحت اور ان کے حقوق استعمال کرتے ہوئے کام کرتا ہے۔ خلیفہ (قاضی کا تقرر کرتے وقت) مسلمانوں کا صرف پیغامبر یا کارندہ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ ان کا پیغامبر ہوتا ہے اس لیے اس سے صادر ہونے والے تمام افعال درحقیقت مسلمان عوام کے افعال ہوتے ہیں جن کا اختیار خلیفہ کے انتقال کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی اس اختیار کا استعمال جاری رکھتا ہے۔"(٦)

ایک قدیم تر فقیہ قاضی ابوبکر الباقلانی (متوفی ۴۰۳ھ) نے اس نکتے کی وضاحت بہتر انداز میں کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"امام جن اختیارات کا استعمال کرتا ہے وہ ان تمام کا استعمال امت کے کارندے اور نمائندے کی حیثیت سے کرتا ہے۔ امت ہمیشہ امام کے پیچھے رہتی ہے تاکہ اس کی اصلاح کرتی رہے۔ اسے صراط مستقیم پر قائم رکھے، اسے یاد دہانی کرتی رہے۔ اسے تنبیہ اور نصیحت کرتی رہے۔ اور جب کوئی حق اس پر واجب ہو اس سے وصول کرے اور جب وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس کے باعث اس کی برطرفی ضروری ہو اسے معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ امام مقرر کردے۔"(٧)

دوسرے مفکرین جیسے سعدالدین تفتازانی، عضدالدین ایجی اور امام رازی بھی ایسی ہی رائے رکھتے ہیں وہ امت ہی کو اختیار حکمرانی کا حامل تصور کرتے ہیں۔[۸]

چونکہ امامت دو فریقوں یعنی امت اور امام کے مابین ایک معاہدہ ہے اس لئے لازمی طور پر اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ معاہدہ باہمی رضامندی سے ہونا چاہیئے اور اس پر عمل درآمد ان شرائط کے مطابق ہونا چاہیئے جو قانون معاہدات میں درج ہیں۔ اس میں ایک پہلو گواہی کا بھی پایا جاتا ہے۔ معاہدہ کرنے والے دو فریقوں میں سے ایک یعنی امت کے ارکان اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ دوسرا فریق اس کا مستحق ہے کہ اسے کارندہ مقرر کیا جائے۔ لہذا فقہاء کی ایک بڑی تعداد نے رائے دہندگان کے لئے یہ شرط عائد کی ہے کہ وہ ان شرائط کو پورا کرتے ہوں جو گواہ کے لئے ضروری ہیں۔ پاکستان کے مفتی محمد شفیع اور عراق کے شیخ قحطان عبدالرحمان الدوری بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔[۹]

مسلم فقہاء نے امام کی شرائط و صفات اور قابلیت و لیاقت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان چیزوں کو یہاں دھرانا طوالت کا موجب ہوگا۔ تاہم اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام کو اپنی نیکی، تقویٰ، سیاست دانی اور سیاسی قابلیت کے لحاظ سے امت میں ممتاز ہونا چاہیئے۔ یہ آخری پہلو نیکی اور تقویٰ سے بھی زیادہ اہم ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ اگر کسی امیر کے انتخاب کا مسئلہ ہمارے سامنے ہو اور ہمیں دو اشخاص میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو جن میں سے ایک نیک لیکن ناتجربہ کار اور دوسرا نیکی میں نسبتۃً کم لیکن سیاسی اور حکومتی امور میں زیادہ تجربہ رکھتا ہو تو ترجیح اس شخص کو دی جانی چاہیئے جو نیکی میں خواہ نسبتۃً کم ہو لیکن تجربے میں زیادہ ہو۔ یہی رائے امام ابن تیمیہؒ کی ہے۔[۱۰]

اس نقطہ نظر کی تائید حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طرز عمل سے بھی ہوتی ہے۔ صحابہؓ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اپنی نیکی، عبادت گزاری اور زہد

جانثاری کے باعث اپنے ساتھیوں میں ممتاز تھے لیکن نہ تو وہ نظم و نسق اور حکومتی معاملات چلانے کا طبعی رجحان رکھتے تھے نہ تجربہ۔ لہٰذا نہ تو انہیں کوئی عہدہ دیا گیا نہ کوئی اور سرکاری ذمہ داری۔ ان لوگوں میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ جیسے بزرگ صحابہ شامل ہیں۔ اس کے برخلاف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کو دیئے جو یقیناً نیکی دینی علم اور اللہ سے ڈرنے میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن مسعود کے ہم پلہ نہیں تھے۔

۲۔ کیا اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ بن سکتی ہے۔

پارلیمنٹ کو اپنے موجودہ مفہوم کے لحاظ سے بہت سے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور یہ فرائض ہر ملک میں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ انہیں مندرجہ ذیل چھ اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ قانون سازی سے متعلق فرائض

۲۔ انتظامی فرائض

۳۔ مالی فرائض

۴۔ انتخابی فرائض

۵۔ عدالتی فرائض

۶۔ غور و فکر یا بحث مباحثہ سے متعلق فرائض

ان میں سے کچھ فرائض تو ان فرائض سے ملتے ہیں جو ہماری گزشتہ تاریخ میں اہل حل وعقد بجا لاتے رہے ہیں جب کہ کچھ دوسرے ایسے ہیں جو شوریٰ کے دائرے میں آتے ہیں۔ جہاں تک پارلیمنٹ کے عدالتی فرائض کا تعلق ہے (جیسا کہ برطانوی دارالامرا) تو جو تاریخی شہادت ہم تک پہنچی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل حل وعقد یا شوریٰ نے یہ فرائض کبھی انجام نہیں دیئے، یہ فرائض عدالتیں ادا

کرتی تھیں یا سربراہ مملکت اپنے اپیلوں کے اختیار سماعت کو بروئے کار لاتے ہوئے خود انجام دیتا تھا۔ جہاں تک پاکستان میں پارلیمنٹ کے قانون سازی سے متعلق فرائض کا تعلق ہے سب لوگ اس پہ متفق ہیں کہ ہماری پارلیمنٹ کو بنیادی طور پہ برطانوی پارلیمنٹ سے جسے پارلیمانی اداروں کی ماں (MOTHER PARLIAMENT) کہا جاتا ہے اور جو بقول مغربی قانون دانوں کے کسی مرد کو عورت اور عورت کو مرد بنا دینے کے سوا سب کچھ کر گزرنے کا قانونی اختیار رکھتی ہے مختلف ہونا چاہیئے۔ ہماری پارلیمنٹ اپنے آپ کو اس امر کا پابند کر چکی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اصول کو بحال رکھے گی۔ وہ تسلیم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے عوام کو مقدس امانت کے طور پہ جو اختیار تفویض کیا ہے اسے انہی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جانا چاہیئے جو اس حاکم مطلق اور فرمانروائے حقیقی نے قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں متعین کر دی ہیں۔[11] ہماری پارلیمنٹ پابند ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو قرآن و سنت کے منافی ہو اگر پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون نافذ کر دے جو قرآن و سنت کے منافی ہو تو ہمارے موجودہ دستور کی دفعہ ۲۰۳ اور اس کے بعد کی دفعات سے اس کا مناسب سدباب ہو سکتا ہے۔ مزید برآں گزشتہ صفحات میں ہم نے اس امر پہ بحث کی تھی کہ ایسے معاملات میں جہاں قرآن و سنت نے کوئی حکم نہ دیا ہو امت کو فیصلے کرنے کی وسیع آزادی حاصل ہے۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امت کے با اعتماد نمائندوں کے لئے وسیع میدان موجود ہے کہ وہ قیاس۔ استحسان استصلاح وغیرہ کے طریقوں سے کام لیتے ہوئے قواعد و ضوابط تیار کریں۔ جب تک ہمارے ملک میں پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے قوانین کا عدالتی جائزہ لینا اور قرآن و سنت سے متصادم قوانین کو حدود آئین سے متجاوز (ULTRA VIRES) قرار دینے کے لئے عدالتیں موجود ہیں اس وقت تک اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ پارلیمنٹ کو ایسے انضباطی معاملات میں قانون سازی کے ضروری اختیارات

دے دیئے جائیں جو نص یا اجماع کے دائرے میں نہ آتے ہوں اور جن میں پارلیمنٹ REGULATORY قانون وضع کر سکے۔

صرف یہ حقیقت کہ لفظ پارلیمنٹ یا اس کا موجودہ تصور کا ماخذ مغربی تاریخ ہے اسلامی نقطہ نظر سے اس امر کے لئے کافی وجہ جواز مہیا نہیں کرتی کہ اس صدیوں پرانے ادارے کو خام فکری اور جلد بازانہ فیصلے کے نتیجے کے طور پر ختم کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور خلفائے راشدین کی تاریخ سے ایسی بہت سی مثالیں اور نظیریں مل جائیں گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قوموں کے لئے بہت سے ادارے اور طریقے اختیار کئے۔ اگر یہ دیکھا گیا کہ یہ ادارے اور طریقے اسلام کے خلاف نہیں تو انہیں جوں کا توں اختیار کر لیا گیا۔ کبھی ایسا ہوا کہ ان میں امت کی ضرورت کے مطابق ردو بدل کر لیا گیا اور ان میں اسلامی روح پھونک دی گئی۔ اس سلسلے میں جنگی چالیں اور محاصل کی وصولی بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فارسی کے بطور سرکاری زبان استعمال کئے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا اور اس کی یہ حیثیت آئندہ تقریباً پچھتر سال تک باقی رہی یہاں تک کہ حجاج بن یوسف نے اس کے بجائے عربی کو رواج دیا۔

خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مقامی رواجوں اور اداروں کو جو ان دنوں عرب میں موجود تھے۔ ضروری ترمیموں اور تبدیلیوں کے ساتھ اختیار کیا اور انہیں بجا طور پر اسلامی قانون میں صحیح مقام ملا۔ تاہم انہیں پورے طور پر اسلامی ڈھانچے میں ڈھال لیا گیا۔ ہم پہلے بھی پارلیمنٹ کی نوعیت اور فرائض میں تبدیلیاں پیدا کر چکے ہیں۔ اگر اسلامی نقطہ نظر سے مزید تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہو تو باہمی مشورے سے اس میں مزید اہم ترامیم کی جا سکتی ہیں۔ ہمیں دوسری اقوام کے علم اور تجربے سے استفادہ کرنے میں ہرگز جھجک محسوس نہ کرنی چاہیئے۔ اگر کسی قوم نے کسی ایسی بھلائی کے حصول کا نیا اور بہتر طریقہ دریافت کر لیا ہے جس کا اسلام بھی داعی ہے تو ہمیں ضروری تبدیلیوں کے بعد اسے اپنانے

میں تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جو عموماً نقل کی جاتی ہے اور جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ الحکمۃ ضالۃ المومن انی وجدھا فھو احق بھا۔ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی دولت ہے جہاں کہیں اور جب کبھی اسے ملے وہ اس (حکمت) کا زیادہ حقدار ہے۔"(۱۲)

موجودہ پارلیمنٹ کے کچھ فرائض اسلامی دور میں اہل حل وعقد بجالاتے تھے۔ وہ انتظامی اور انتخابی فرائض انجام دیتے تھے۔ ملکی معاملات میں مشورہ اور تبادلۂ خیال سے متعلقہ فرائض شوریٰ کے ذمے تھے۔ رہی قانون سازی تو وہ خالصتاً غیر سرکاری سطح پر فقہائے امت اور قضاۃ عدالت انجام دیتے تھے۔ یہ دو ادارے یعنی شوریٰ اور اہل حل وعقد بیشتر صورتوں میں دو ممتاز الگ الگ ادارے تھے۔ اہل حل وعقد کے مقابلے میں شوریٰ ایک چھوٹی تنظیم تھی۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں ان صحابہ کو خصوصی امتیاز حاصل تھا جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی تھی اور یہی وہ لوگ تھے جن پر اہل حل وعقد کی اکثریت مشتمل تھی۔ جب عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ خلافت کا منصب سنبھال لیں تو انہوں نے اس وقت کے مروجہ طریقہ کار کے بارے میں قانونی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ آپ کا کام نہیں یہ اہل بدر کا ہے۔ جس سے اہل بدر راضی ہوں گے وہی خلیفہ بنے گا۔ آنجناب کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے دو جلیل القدر شافعی فقہا علامہ خطیب شربینی (متوفی ۹۷۷ھ) اور علامہ شہاب الدین رملی (متوفی ۱۰۰۴ھ) کہتے ہیں۔

"اس لئے کہ معاملات کا انتظام و انصرام ان (اہل بدر) کے ہاتھ میں ہے اور تمام لوگ انہی کی پیروی کرتے ہیں۔"(۱۳)

اگرچہ اہل حل وعقد انتخابی ادارے کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے ہیں لیکن اس امر کو کبھی ضروری اور لازمی نہیں سمجھا گیا کہ رائے دہندگی کا حق صرف انہی تک محدود کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اجتہاد مصلحت وقت اور عرف میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہر وہ قانون جس کی اساس مصلحت وقت عرف یا ایسے ہی ثانوی ماخذ پر ہو وہ زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس میں مناسب ترمیم بھی کی جا سکتی ہے اس معاملے میں مشہور قانونی اصول یہ ہے۔

لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان۔

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وقت کے بدل جانے سے احکام (جن کی بنیاد ثانوی ماخذ پر ہو) بدل جاتے ہیں۔"

زمان و مکان کی روح سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے جب کبھی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اہل حل و عقد سے متعلق طرز عمل میں بھی تبدیلی آئی۔ تاہم وہ اصل اصول جو اس میں کارفرما تھا جوں کا توں رہا۔ یعنی عوام کا اعتماد اور رضامندی مثال کے طور پر امام غزالی فرماتے ہیں۔

فان شرط ابتداء الانعقاد قیام الشوکة۔ ولا تقوم الشوکة الا بموافقة الاکثرین من معتبری کل زمان۔

"معاہدہ (امامت) کے ابتداءً وجود میں آنے کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ (امام کا) اقتدار قائم ہو جائے اور اقتدار اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک ان لوگوں کی اکثریت اس کا ساتھ نہ دے جو ہر زمانے میں معتبر سمجھے جاتے ہیں۔"(١٤)

بلکہ ایک جگہ تو امام غزالی اس سے بھی آگے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"اگر کسی فرد واحد کو اتنی مقبولیت حاصل ہو اور اسے عوام کا اتنا اعتماد حاصل ہو کہ اس کی منظوری اور پسندیدگی عوام کی پسند اور منظوری سمجھی جائے تو صرف اس کا بیعت کر لینا ہی کافی ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

فالشخص الواحد المتبوع المطاع.... اذا بايع کفی اذتی موافقته موافقة الجماهیر(۱۵)

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اہل حل وعقد کا انتخاب صرف اہل مدینہ میں سے کیوں کیا جاتا تھا مسائل و معاملات کے تصفیے میں آخر مدینے سے باہر پھیلی ہوئی پوری اسلامی دنیا کو نمائندگی کیوں نہیں دی جاتی تھی۔ ہمارے قدیم مصنفین نے بھی اس سوال کا نوٹس لیا تھا۔ مثلاً قاضی ابوبکر باقلانی (متوفی ۴۰۳ھ مطابق ۱۰۱۲ء) اور علامہ ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ مطابق ۱۰۶۴ء) نے بھی اس کا جواب دیا ہے۔ ان اصحاب کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"تمام اسلامی شہروں اور علاقوں کے اہل حل وعقد کا کسی ایک مقام پر جمع ہونا اور کسی ایک شخص کی بیعت پر اتفاق کر لینا ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اہل حل وعقد دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے تھے تاہم ذرائع نقل وحمل کی کمی کے باعث انہیں باقاعدگی سے دارالخلافہ میں نہیں بلایا جا سکتا تھا"

مزید برآں کم از کم خلفائے راشدین کے دور میں اہل حل وعقد ہمیشہ صرف ایک شہر یعنی مدینے میں موجود رہتے تھے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاعدہ تھا کہ غزوہ بدر میں حصہ لینے والے اور بیعت رضوان میں موجود صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مدینہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے اور وہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہونے کی عموماً اجازت نہیں دیتے تھے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں اہل حل وعقد کے ادارے کی تعبیر و تشریح مختلف انداز میں کی جاتی رہی ہے۔ مختلف ملکوں اور مختلف اوقات میں اس کے ارکان بھی بدلتے رہے ہیں۔ اس تبدیلی اور اختلاف کی وجہ یہ رہی ہے کہ حالات میں تغیر پیدا ہوتا رہا۔ تقاضے اور ضرورتیں بدلتی رہیں اور مصلحت وقت میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی۔ لیکن بنیادی اصول ہمیشہ وہی رہے۔ دور خلافت راشدہ میں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں غزوہ بدر اور بیعت رضوان میں حصہ لینے والے اور دیگر ممتاز صحابہ مجلس اہل وعقد

کے رکن تھے۔ بعد کے زمانوں میں قبائل کے سردار، اہل علم و دانش، فقہاء، نمایاں عوامی شخصیتیں (اشراف و اعیان) قاضی اور وزیر حسب ضرورت اہل حل و عقد میں شامل کئے جاتے رہے۔ جس شخص کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہے اس کو ادارے میں شامل کر لیا جاتا تھا بشرطیکہ وہ ضروری قابلیت و مہارت کے وصف سے آراستہ ہو۔

چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں مصر کے مفتی محمد عبدہ (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) نے تجویز پیش کی کہ اہل حل و عقد کو ایسے افراد پر مشتمل ہونا چاہیئے جن کی طرف لوگ اپنی ضروریات کی تکمیل اور مسائل کے حل کے لئے رجوع کرتے ہوں۔ جیسے ٹریڈ یونینوں کے نمائندے صنعت کار، مزدور رہنما، دیہاتیوں اور کاشتکاروں کے رہنما، سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور صحافی وغیرہ۔[۱۲]

لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اہل حل و عقد کی شرائط قابلیت کیا ہونی چاہیئے۔ اس موضوع پر ہر دور کے مسلم فقہاء نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور مختلف مفکرین نے مختلف شرائط قابلیت تجویز کی ہیں۔ لیکن جو شرائط قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہیں اور جن پر تمام فقہاء اور مفکرین متفق ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اولوالامر/اہل حل و عقد (بشمول سربراہ مملکت) کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہدے کے پوری طرح اہل ہوں۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی تاکہ وہ اپنے فرائض حسن و خوبی انجام دے سکیں۔ قرآن مجید عمومی انداز میں صرف اسی دو طرفہ شرائط اہلیت کا ذکر کرتا ہے اگر واضح زیادہ اور عملی انداز میں بات کرتی ہو تو پھر اس اہلیت کی عملی تشریح مختلف زمانوں میں مختلف ہو گی۔ اب ظاہر ہے کہ آج سے پانچ سو سال قبل سالار عسکر کے لئے جو شرائط اہلیت موزوں قرار دی جاتی تھیں وہ آج موزوں نہیں ہوں گی۔ سربراہ مملکت کے لئے جن معلومات کا حاصل ہونا پانچ سو سال قبل ضروری سمجھا جاتا تھا آج وہ معلومات ناکافی بلکہ شاید نقصان دہ ہی ہوں۔ لہٰذا آج کے لئے مناسب ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی تفصیلات آج کے

فقہاہی متعین کر سکتے ہیں ۔ یہ بھی ضروری ہو گا کہ ان تفصیلات کے تعین میں آج کے عرف اور مصلحت کو پیش نظر رکھا جائے۔[۱۷]

۲۔ انہیں عدل ہونا چاہیئے یعنی اپنے عقیدے اور کردار میں راست رو اور سچے اور کم از کم باعمل مسلمان ہونا ضروری ہے ۔ عدل کی شرط پر تفصیلی بحث کے لئے مندرجہ ذیل ماٰخذ دیکھئے ۔

(الف) ماوردی الاحکام السلطانیہ ۔ ص ۶ - ۶۶

(ب) قاضی ابویعلی الفراء الاحکام السلطانیہ ص ۱۹ - ۲۰ - ۶۰ - ۶۱

(ج) قحطان دوری ۔ الشوری بین النظریۃ والتطبیق ص ۱۱۰ - ۱۱۲

(د) شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفاء ۔ طبع لاہور

(ہ) شاہ ولی اللہ ۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ باب خلافت

۳۔ کچھ علماء مسلمان ہونے کی شرط کو صفت عدل کی شرائط میں شامل سمجھتے ہیں اور کچھ اس کو ایک الگ شرط قرار دیتے ہیں ۔ اہل حل وعقد کو بہر حال مسلمان ہونا چاہیئے۔

ان کے علاوہ کچھ اور شرائط قابلیت بھی ہیں جنہیں عدالتی طور پر تو نافذ نہیں کیا جا سکتا لیکن ویسے پیش نظر رکھا جانا چاہیئے ۔ جیسا کہ نیکی تدبر و حکمت وغیرہ

۳۔ شوریٰ اور قانون سازی کا دائرہ کار

آج ہم پارلیمنٹ کے قانون سازی اور غور وفکر سے متعلق فرائض کے لئے بنیادی طور پر شوریٰ ہی کو ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں ۔ شوریٰ کے فرائض اس لحاظ سے انتظامی بھی ہیں کہ وہ حکومت کے انتظامی اور دیگر امور کی نگرانی اور جانچ پڑتال کرتی ہے ۔ اسلامی ریاست میں قانون سازی کی حدود اور اس سلسلے میں امت کو جو آزادی دی گئی ہے ۔ اس پر کسی قدر تفصیلی بحث گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے ۔

یہاں خلاصے کے طور پر عرض ہے کہ مندرجہ ذیل پہلو ایسے ہیں جن میں ہم آج شوریٰ کو قانون سازی کے

اختیارات دے سکتے ہیں، لیکن پارلیمنٹ کی طرز پر تشکیل پانے والی شوریٰ کو اختیارات دینے سے قبل خاصے سوچ بچار کی ضرورت ہوگی، پارلیمنٹ کی تشکیل اس طرح کرنی پڑے گی کہ اس میں شریعت کا علم اور اسلامی کردار رکھنے والوں کی ایک مؤثر اور قابل ذکر تعداد موجود ہے۔

۱۔ اگر کسی نص کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہوں تو شریعت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے کسی ایک تعبیر کو اختیار کرنا۔

۲۔ اسلامی قوانین کے صحیح نفاذ کے لئے وسائل اور طریقے دریافت کرنا۔

۳۔ ایسے معاملات کے بارے میں قوانین بنانا جنہیں شریعت نے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

۴۔ مقاصد شریعت کی تکمیل کے لئے تمام ضروری اقدامات کرنا۔

قانون سازی کی آزادی کے یہ چار پہلو محض من مانے نہیں ہیں مندرجہ بالا صفحات کی روشنی میں درج ذیل بحث اس معاملے کو اور زیادہ واضح کر دے گی۔

قرآن مجید میں متعدد آیات ایسی ہیں جن سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ ارکان امت کے درمیان شہریوں اور حکمرانوں کے درمیان اور اولوالامر کے مختلف طبقات کے درمیان تنازع اور اختلاف رائے پیدا ہو سکتا ہے۔

آپس میں برسر نزاع فریقوں کے باہمی اختلافات اور جھگڑے ان اصولوں کی بنیاد پر طے ہونے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلے کی چند آیات اور ان کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذالک

خیر و احسن تاویلا۔ (۱۸)

" اے ایمان والو۔ تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کی بھی پھر اگر کسی امر میں تم میں باہم اختلاف پیدا ہو جائے تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے"۔ یہ آیت واضح طور پر اختلاف رائے کی اجازت دیتی ہے حتیٰ کہ ایسے معاملات میں بھی جہاں کوئی نص موجود ہو۔ چنانچہ اس نص کی صحیح تعبیر و تفسیر کے لئے اسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔

وما اختلفتم فیہ من شی فحکمہ الی اللہ۔ (۱۹)

اور جس امر میں تم میں اختلاف پیدا ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔

ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم (۲۰)

اور اگر یہ لوگ اس کو رسول اور ان لوگوں کے حوالے کرتے جو ان میں صاحب اختیار ہیں تو وہ لوگ اس کو جان لیتے جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں۔

قرآن مجید میں ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو امت کے مابین جائز اختلاف رائے کو ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کرتی ہیں۔ ان اختلافات کو حل کرنے کے لئے اسلام نے جو علاج تجویز کیا ہے وہ شوریٰ کا ادارہ ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل دو آیات میں شوریٰ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم۔ (۲۱)

اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔

یہ آیت قرآن مجید میں اس مقام پر واقع ہوئی ہے جہاں مسلمانوں کی چند نمایاں خصوصیات بیان کی گئی ہیں اس سیاق و سباق میں نماز کا تذکرہ کرنے کے فوراً بعد حتیٰ کہ زکوٰۃ کے ذکر سے بھی پہلے شوریٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت ہے۔

وشاورھم فی الامر (۲۲)

اور مسائل کے بارے میں ان سے مشورہ کرتے رہیئے۔

مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کے اس سیاق و سباق میں واقع ہوئی ہے جہاں حضور نبی کریم صلعم کے مسلمانوں سے تعلقات کا ذکر ہے۔

بہت سی احادیث میں بھی شوریٰ کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگی مصالح کے بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے کیونکہ بیشتر معاملات انہی سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن احکام شریعت سے متعلق وہ ان سے کوئی رائے نہ لیتے کیونکہ ان کی تمام اقسام یعنی فرض۔ مندوب۔ مکروہ۔ مباح اور حرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ (۲۳)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ (۲۴)

۳۔ مشورہ دینے والے کی حیثیت امانت دار کی سی ہے۔ پس جب کسی سے مشورہ لیا جائے اسے چاہیئے کہ وہ وہی رائے دے جو اپنے لئے پسند کرے۔ (۲۵)

۴۔ اگر کسی سے اس کا بھائی مشورہ طلب کرے اور وہ بغیر سوچے سمجھے رائے دے تو وہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ (۲۶)

۵۔ کوئی شخص مشورے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ (۲۷)

۶۔ جب تک تمہارے رہنما وہ لوگ ہوں جو تم میں بہترین ہوں تمہارے دولت مند مخیر ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہوں اس وقت تک زمین کی چھاتی تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے اور جب تمہارے رہنما ایسے لوگ بن جائیں جو تم میں سے سب سے زیادہ برے

ہوں اور تمہارے امیر لوگ بخیل اور لالچی ہو جائیں اور تمہارے معاملات عورتوں کے ہاتھ میں پہنچ جائیں اس وقت زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی چھاتی سے بہتر ہے۔[۲۸]

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ہر اہم معاملے میں شوریٰ کی طرف رجوع کیا۔ ایسے مواقع پر جو گفتگو اور سوچ بچار ہوا مورخین اور محدثین نے اس کی تفصیلات کو محفوظ رکھا ہے۔ جن اہم معاملات پر مشورے کے لئے شوریٰ کے اجلاس ہوئے ان میں سے مندرجہ ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ غزوہ بدر کے لئے میدان جنگ کا تعین

۲۔ غزوہ احد کے لئے میدان جنگ کا تعین

۳۔ اسیران بدر کے بارے میں مناسب سلوک کا فیصلہ

۴۔ غزوۂ خندق کے موقع پر مدینے کے دفاع کا مسئلہ

۵۔ غزوۂ خندق میں مدینے پر چڑھائی کرنے والے بعض قبائل کے ساتھ التوائے جنگ کا معاہدہ

۶۔ واقعہ افک

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہ کرام نے بھی شوریٰ کا ادارہ باقی رکھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مباح امور کے بارے میں اہل علم حضرات میں سے با اعتماد لوگوں کے ساتھ مشورہ کیا کرتے تھے۔ تاکہ ان میں آسان ترین چیز کو اختیار کر لیا جائے۔ لیکن اگر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے مسئلے کی وضاحت ہو جاتی تو وہ قرآن وسنت سے تجاوز کر کے کسی اور چیز کو ہرگز نہ اختیار کرتے وہ سب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے تھے۔

امام بیہقی اور دارمی نے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابوبکر کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو وہ اس کا حل قرآن مجید میں تلاش کرتے۔ اگر وہاں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے اگر وہاں بھی

وہ مسئلہ نہ ملتا تو مسلمانوں کے سرکردہ اصحاب اور اہل علم لوگوں کو بلاتے اور ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ لوگ کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو معاملے کا تصفیہ اسی کے مطابق کر لیا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شوریٰ کا ادارہ زیادہ منظم بنیادوں پر قائم کیا۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات بڑی نمایاں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اس کام میں کوئی خیر نہیں جس کا فیصلہ شوریٰ کے بغیر کیا گیا ہو۔"[29]

حضرت عمرؓ نے صحیح طریقے کے مطابق شوریٰ سے استفادہ کئے بغیر کبھی کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کیا باقلانی بیان کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے تمام فضل و کمال تفقہ فی الدین اخذ احکام اور قیاس کے طریقوں میں گہری بصیرت اور احادیث و آثار کا وسیع علم رکھنے کے باوجود اپنے اصحاب کے اجتماع ان کی موجودگی اور مشورے کے بغیر کبھی کوئی حکم نافذ نہ فرماتے تھے۔[30]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں قانون سازی کے فرائض کی انجام دہی میں شوریٰ برابر شریک رہتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو وہ شوریٰ سے مشورے کے بعد اس کا فیصلہ فرماتے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ ایک ایک مہینہ تک اپنے ساتھیوں کے مشورے سے ایک مسئلہ پر غور فرماتے رہتے تھے۔[31]

روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عورتوں سے بھی مشورہ لیتے تھے۔[32]

مولانا شبلی نعمانی نے اپنی یادگار کتاب "الفاروق" میں حضرت عمرؓ کی شوریٰ کی تفصیل بیان کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے متعدد ایوان (CHAMBERS) تھے۔ وہ تین علیحدہ علیحدہ ایوانوں پر مشتمل تھی جو مختلف قسم کے مسائل سے بحث کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے تھی کہ شوریٰ امام کی ذمہ داریوں میں شریک ہوتی ہے اور اس امانت کا بوجھ اٹھانے میں اس کی مددگار ہوتی ہے جو امت کی جانب سے اس کے کاندھوں پر ڈالا جاتا ہے سوادِ عراق کی زمینوں کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے جو شوریٰ بلائی گئی اس کا افتتاح کرتے ہوئے آپ نے اپنے مشہور خطبے میں فرمایا۔

"میں نے آپ کو صرف اس لئے زحمت دی ہے کہ آپ اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے میں میرے ساتھ شریک ہوں جو میرے کاندھوں پر ڈال دی گئی ہے اور جو آپ ہی کے امور و معاملات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس معاملے میں میں بھی آپ کی طرح کا ایک فردِ واحد ہوں اور نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں"[۳۴]۔ خلفائے راشدین کے دور میں شوریٰ نے جو مسائل طے کئے ان کی اہم ترین مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خلافت کا مسئلہ

۲۔ مرتدین کا مسئلہ

۳۔ مانعین زکوٰۃ کا مسئلہ

۴۔ دادی کی وراثت کا مسئلہ

۵۔ نشہ آور اشیاء کے استعمال کی سزا

۶۔ جنگوں سے تعلق رکھنے والے مسائل

۷۔ دیگر سرکاری پالیسیوں سے تعلق رکھنے والے مسائل

ان مواقع پر جو غور و فکر ہوا اور جو فیصلے کئے گئے ان کی تفصیلات مولانا حامد الانصاری غازی نے اپنی کتاب اسلام کا نظام حکومت[*] میں بیان کی ہیں۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوریٰ کے اختیارات اور فرائض میں انتظامی، قانون سازی اور غور و فکر یا مشوروں سے متعلق تمام معاملات شامل ہیں۔

اب ہمیں مختصر طور پر یہ دیکھنا چاہیئے کہ شوریٰ اور اس کے فرائض سے متعلق مسلم فقہا اور مفکرین نے

کیا کہا ہے مسلم سپین کے مشہور فقیہہ اور قاضی ابن عطیہ (متوفی ۵۴۱ھ / ۴۷-۱۱۴۶ء) لکھتے ہیں۔

"شوریٰ شریعت کی بنیاد اور اس کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے جو (صاحب اقتدار) شخص اہل علم اور دیندار لوگوں سے مشورہ نہیں کرتا اسے معزول کر دینا واجب ہے۔ اس مسئلے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں (شوریٰ کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے) جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ایمان والوں کی تعریف کی ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔"(۳۴)

اسپین ہی کے ایک اور نامور فقیہہ اور محدث قاضی ابو بکر ابن العربی (متوفی ۵۴۳ھ/۱۱۴۸-۴۹ء) شوریٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یہ ایک اجماع ہے جس کا مقصد کسی مسئلے پر غور کرنا ہوتا ہے تاکہ سب لوگ ایک دوسرے سے مشورے کے بعد اپنا نقطہ نظر بیان کر سکیں۔"

قرآن مجید کے مسلمہ لغت نگار امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ/۹-۱۱۰۸ء) شوریٰ کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"شوریٰ یہ ہے کہ رائے ایک دوسرے سے مشورے کے بعد قائم کی جائے۔"(۳۵)

قرآن مجید کے ایک شیعہ مفسر شیخ ابو علی الطبرسی (متوفی ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء) کی رائے ہے کہ "شوریٰ کا مطلب ہے سوچ بچار اور تبادلہ خیالات تاکہ سچائی واضح ہو کر سامنے آئے۔"(۳۶)

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ شوریٰ کے ادارے کی اس انتہائی اہمیت کے باوجود بعض لوگ دعویٰ کر ڈالتے ہیں کہ امیر پر شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی لازمی نہیں۔ یہ رائے اس قدر کمزور ہے کہ اسے بادی النظر میں ہی رد کر دینا چاہیئے۔ اس رائے کے حاملین دلیل کے طور پر عہد صدیقیؓ کی دو نظیروں کی غلط تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دو نظیریں مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد اور جیش اسامہ کی روانگی کے بارے میں ہیں۔

چونکہ ان دو نظیروں کا اس ضمن میں بہت ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لیتے ہیں کبھی کبھی اس غلط رائے کی بنیاد لفظ "عزم" کی غلط تعبیر پر رکھی جاتی ہے جو سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں وارد ہوا ہے۔ آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ "اور ان سے مسائل میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیجئے۔"

اس مقام پر لفظ عزم سے بعض اصحاب کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ شوریٰ کی رائے محض ایک سفارش یا مشورے کی حیثیت رکھتی ہے جس کی پابندی ضروری نہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل حدیث سے بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں لفظ عزم کے کیا معنی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشاورۃ اھل الرای ثم اتباعھم (اہل الرائے سے مشورہ لینا۔ پھر اس کی پابندی کرنا۔)[۳۷]

چوتھی صدی ہجری کے حنفی فقیہ اور مشہور مفسر قرآن علامہ ابوبکر جصاص نے بھی اس امر کا احساس کرتے ہوئے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں آیت زیر بحث کے متعلق غلط فہمی پائی جاتی ہے اپنی تصنیف احکام القرآن (جلد ۲ صفحہ ۵۰) میں لکھا ہے۔

"عزم کا لفظ شوریٰ کے بعد لانا اس بات کی دلیل ہے کہ عزم کو شوریٰ سے صادر ہونا چاہئے"۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

"اگر میں مشورے کے بغیر کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکتا تو ابن ام عبد کو نامزد کر دیتا"۔[۳۸]

اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اچھی رائے رکھنے کے باوجود انہیں نامزد نہیں فرمایا کیونکہ شوریٰ اس کی منظوری نہ دیتی۔

شوریٰ کے موضوع پر اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم ابن خویز منداد کا ایک قول نقل کرنا چاہتے

ہیں جو انہوں نے شوریٰ کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

"حکمرانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے معاملات کے بارے میں جو انہیں معلوم نہ ہوں اور ایسے دینی امور کے بارے میں جو انہیں مبہم محسوس ہوں اہل علم سے مشورہ کریں اور ایسے معاملات کے سلسلے میں جو جنگ سے تعلق رکھتے ہوں مسلح افواج کی نمایاں شخصیات سے مشورہ کریں اور عوامی مفاد و دلچسپی سے متعلق امور کے بارے میں عوام کے رہنماؤں سے مشورہ کریں اور ملک کی ترقی و تعمیر سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں اعلیٰ افسروں (سکریٹریز وغیرہ) اور وزراء سے مشورہ کریں۔"[۲۹]

بعض اوقات کچھ لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان شوریٰ کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل میں منظم نہ کر سکے اور دور خلافت راشدہ کے بعد شوریٰ ختم ہو گئی لیکن تاریخی شہادت اس دعویٰ کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد اس عمل کو وہ تاریخی اہمیت حاصل نہیں رہی جو ان کے دور میں حاصل تھی دوسرے یہ کہ بعد کے دور کے نظائر کو ماخذ قانون کی حیثیت سے بھی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ قانون اور علم فقہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس دور کی شوریٰ کی تفصیلات یا نظائر کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم کتب تاریخ میں بعض ضروری تفاصیل موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے اپنی کتاب تاریخ الاسلام السیاسی میں مرابطین موحدین اور سپین کے اموی حکمرانوں کے اختیار کردہ نظام شوریٰ کے بارے میں مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔

(جاری)

حوالہ جات

۱۔ شرح المقاصد بحوالہ قحطان عبدالرحمٰن الدوری۔ الشوریٰ بین النظریۃ والتطبیق مطبوعہ بغداد ۱۹۷۴م صفحہ ۱۹۸

۲- حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ قاہرہ - ۱۳۲۲ھ جلد دوم صفحہ ۱۱۱

۳- عرف کے موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے مندرجہ ذیل مآخذ

ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقاء الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید جلد اوّل طبع دمشق ۱۹۶۴ ص ۱۴۲ - ۱۵۰

محمد اسلام المدخل للفقہ الاسلامی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۰ء ص ۲۴۴ - ۲۷۴

محمد تقی امینی فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء ص ۲۷۱ - ۲۸۰

ساجد الرحمٰن صدیقی: عرف و عادت اور تعامل، اسلامی قانون میں مطبوعہ ماہنامہ فکر و نظر

۴- ان اصولوں پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے۔

شرح مجلۃ الاحکام العدلیہ (باب اول) تالیف خالد الاتاسی یا ابن رستم باز

الاشباہ والنظائر از سیوطی

الاشباہ والنظائر از ابن نجیم

۵- مصلحت کے موضوع پر مزید تفصیل کے لئے دیکھئے کتب مذکورہ بالا:

ڈاکٹر زرقا۔ صفحات ۷۰ - ۱۴۲

تقی امینی۔ صفحات ۲۳۰ - ۲۴۴

مذکور صفحات ۲۵۸ - ۲۶۱

۶- بدائع الصنائع کتاب القضا جلد ۷ ص ۱۶

۷- کتاب التمہید از باقلانی ص ۱۸۴

۸- تفتازانی - شرح المقاصد - جلد ۲ صفحہ ۲۷۲

الایجی المواقف بحوالہ شرح المواقف جلد ۸ صفحہ ۳۵۵

۹- دیکھئے مفتی محمد شفیع کی تصنیف جواہر الفقہ جلد دوم صفحات ۲۹۵ - ۳۰۱ مطبوعہ کراچی)

۱۰۔ بحوالہ مولانا امین احسن اصلاحی اسلامی ریاست ص ۱۲۰

۱۱۔ دیکھئے قرارداد مقاصد جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی تمہید ہے۔

۱۲۔ اس نکتے پر تفصیلی بحث کے لئے مندرجہ ذیل ماخذ کا مطالعہ کیجئے۔

(۱) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر تالیف مولانا محمد تقی امینی صفحات ۲۸۰- ۲۸۴

(ب) حجۃ اللہ البالغہ تالیف حضرت شاہ ولی اللہ چھٹی بحث باب ۲۱

۱۳۔ دیکھئے شربینی کی کتاب مغنی المحتاج جلد ۴ صفحہ ۱۳۰ اور نہایۃ المحتاج مصنفہ رملی جلد ۷ صفحہ ۳۹۰

۱۴۔ فضائح الباطنیہ ص ۱۷۷

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ دیکھئے تفسیر المنار جلد ۵ صفحات ۱۸۱ - ۱۸۷

۱۷۔ عمومی حوالے کے لئے دیکھئے قرآن مجید سورۃ النساء ۵۸ سورۃ البقرہ ۲۴۷ سورۃ یوسف ۵۵، سورۃ القصص ۲۶

۱۸۔ القرآن ۴ - ۵۹

۱۹۔ القرآن - ۴۲ - ۱۰

۲۰۔ القرآن - ۴ - ۸۳

۲۱۔ القرآن - ۴۲ - ۳۸

۲۲۔ القرآن - ۳ - ۱۵۹

۲۳۔ القرطبی - الجامع الاحکام القرآن - جلد ۱۶ -

۲۴۔ ترمذی - بیہقی -

۲۵۔ مجمع الزوائد۔ جلد ۸۔ صفحہ ۹۶

۲۶۔ بیہقی

۲۷۔ بیہقی

۲۸۔ ترمذی

۲۹۔ بحوالہ محمد الخضری۔ محاضرات تاریخ الأمم الاسلامیہ جلد سوم صفحہ ۱۷

۳۰۔ التمہید مصنفہ باقلانی ص ۲۰۰

۳۱۔ المبسوط الامام السرخسی جلد ۱۶ ص ۸۴

۳۲۔ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۳ ابن جوزی۔ سیرت عمر صفحہ ۱۳۲

۳۳۔ کتاب الخراج

۳۴۔ قرطبی الجامع لاحکام القرآن۔ جلد صفحہ ۲۴۶۔

۳۵۔ بحوالہ روح المعانی جلد ۲۵، ص ۴۲

۳۶۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۳۳

۳۷۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۴۲۰

۳۸۔ ترمذی۔ مستدرک حاکم

۳۹۔ قرطبی۔ الجامع الاحکام القرآن ج ۴ ص ۲۴۹ – ۲۵۰